سورۃ اخلاص
و معوذتین
کی حکیمانہ انقلابی تفسیر

تفسیر سورہ اخلاص و معوذتین

اسلام بین الاقوامی انقلاب کی عالمگیر تحریک ہے جس کے امام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس انقلاب کی بنیاد قرآن حکیم پر ہے۔ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے قریبی صحابہ (ساتھیوں) کی کوششوں سے جو جماعت پیدا ہوئی وہ پہلے عرب پر غالب آئی پھر وہ ایک محدود علاقے میں مرکز اقوام بنی۔ یہ اس کی زندگی کے ابتدائی پچاس سال کی روداد ہے جن میں وہ نہایت اعلیٰ اصول قائم رکھ سکی۔

اس دور کی تاریخ اور فلسفہ، اسلام کے نام پر انقلاب لانے والوں کے لئے، رہتی دنیا تک نمونہ ہے۔ اس دور کی تاریخ امام ولی اللہ دہلویؒ سے بہتر کسی نے نہیں لکھی۔ اور نہ ان کے سوا کسی اور نے اس دور کا فلسفہ معین کیا ہے۔ عہد حاضر میں یورپ اور اس سے اثر لینے والی دنیا کو علمی رنگ میں سوچنے اور سمجھنے کی عادت ہو چکی ہے۔ اسلام کی حقیقت امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے کے سوا اور کسی طریق سے نہیں سمجھائی جاسکتی اور نہ یورپ کی مرکزیت کو اس کے سوا کسی اور طریقے سے توڑا جاسکتا ہے اور یورپ کی مرکزیت توڑے بغیر قرآن اور اسلام کو قائم کرنا ناممکن ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (اللہ کے رسول محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں (سورۃ الفتح) کے کام کے نمونے پر بَرِّ عظیم میں اسلام کو جمہوری رنگ میں غالب کرنے کا ایک جامع سائنٹیفک سیاسی معاشی اور اخلاقی انقلاب کا عملی پروگرام کارل مارکس سے ۱۰۰ سو سال پہلے امام ولی اللہ نے بنایا۔ اس کا محور دہلی تھی۔

تمہید

کسی معاشرے کی اجتماعی زندگی تین ستونوں پر قائم ہوتی ہے :

(۱) سیاسیات

(۲) اقتصادیات اور

(۳) فلسفہ

اگر کسی معاشرے کو ایک "شخص" (Person) مان لیا جائے تو سیاست اس کے اجزاء کو آپس میں مربوط کر کے، اس کے ڈھانچے کو قائم رکھتی ہے۔ اقتصادیات اسے نشوونما بہم پہنچاتی ہے اور فلسفہ اس کی معنوی زندگی کی تنظیم کرتا ہے۔

اگر کوئی مخالف طاقت اس معاشرے پر حملہ کر کے اس کی سیاسی طاقت چھین لے، لیکن اس کا اقتصادی ڈھانچہ (Economic Structure) اور اس کا نظام فکر (Ideology) محفوظ رہیں، تو وہ اپنی سیاسی شکست کا مداوا کر کے اپنی ہستی از سر نَو قائم کر سکتا ہے، تاریخ اس کی بہت سی مثالیں پیش کرتی ہے۔

لیکن اگر اس معاشرے کی فوجی اور سیاسی شکست کے بعد اس میں اقتصادی بدحالی بھی پیدا کر دی جائے لیکن اس کا فکری نظام قائم رہے تو بھی وہ پہلے سے زیادہ محنت کر کے اپنی اقتصادی حالت کی اصلاح اور اپنی سیاسی کمزوری کا مداوا کر سکتا ہے۔ لیکن اگر سیاسی طاقت اور اقتصادی نظام کے ساتھ ہی اس معاشرے کا فکری نظام بھی ٹوٹ جائے تو پھر اس کے معاشرے کا دوبارہ زندہ ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔

برعظیم میں خود ہماری تاریخ اس تاریخی عمل کی ایک مثال ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں برعظیم ہند پر ہمارا قبضہ تھا۔ اس زمانے میں یورپی قومیں اس برعظیم کی طرف بڑھیں انہوں نے یہاں کی حکمران طاقت کو شکست دینے کے لئے پہلے یہاں سیاسی اور اقتصادی غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور پھر فکری حملہ کیا۔

سیاسی میدان میں فرانس اور برطانیہ کی آویزش شروع ہوئی۔ رفتہ رفتہ انگریزوں نے فرانسیسیوں کو نکال باہر کیا۔ 1858ء تک سارے ملک پر خود قابض ہوگئے اور مغل حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ہماری سیاسی اور فوجی شکست تھی۔ اقتصادی میدان میں یورپی قوموں، خصوصاً انگریزوں نے ہماری صنعت و حرفت اور تجارت کو برباد کر دیا۔

ہمارے ملک کی پیداوار، کوڑیوں کے مول خرید کر لے گئے اور اپنی مصنوعات سونے کے بھاؤ ہمارے ملک میں ٹھونس دیں۔ رفتہ رفتہ اس برعظیم کی ساری آبادی کو اقتصادی بدحالی میں مبتلا کر دیا۔ یہ ہماری اقتصادی شکست تھی۔

اس پر اکتفانہ کر کے انگریزوں نے ہم پر فکری حملہ بھی کیا۔ چنانچہ انہوں نے ہمارے مذہبی افکار میں، جو ہماری زندگی کی بنیاد تھے، وسوسے پیدا کرنے شروع کئے۔ یہ ان کا منفی فکری حملہ تھا۔ اس کے ذریعے سے انہوں نے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں اسلامی مذہبی حقائق کے خلاف شکوک پیدا کر کے، ان کے یقین کی جڑیں ہلادیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے افکار ایسے انداز میں پیش کئے کہ ہمارے نوجوان ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ چنانچہ یورپی مادہ پرستانہ سائنس اور فلسفے نے ہمارے نوجوانوں کے افکار میں مزید تزلزل پیدا کر دیا۔ یہ یورپ والوں کا مثبت فکری حملہ تھا۔

اس دوگانہ حملے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا نوجوان طبقہ مغربی افکار سے مرعوب ہو گیا۔ یہاں تک کہ وہ یورپی طرز پر سوچنے لگا اور اپنی شخصیت کھو بیٹھا۔ لیکن ہم میں سے ایک اہم اقلیت نے اس فکری حملے کو برداشت کر لیا۔ وہ اس کے مقابلے کے لئے ڈٹ گئے۔ اور اس نے رفتہ رفتہ محنت کر کے انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کیا۔ [1]

اصل میں کسی قوم کا نظام فکر اس کے فلسفۂ حیات (Philosophy of life) پر مشتمل ہوتا ہے، وہ اس کے افکار میں سے تعارض (Antadonism) دور کر کے وحدتِ فکری پیدا کر دیتا ہے، جس سے معاشرے میں وحدتِ عمل ظاہر ہوتی ہے۔ یہ فکر و عمل کی وحدت ہی اس معاشرے کی نشوونما اور قوت کا موجب بنتی ہے۔ اس کے برخلاف جس معاشرے میں وحدتِ فکری نہ ہو، اس میں انتشارِ عمل پیدا ہو جاتا ہے اور اندرونی اختلافات اس کی بربادی کا باعث بنتے ہیں۔

قرآن کا مرکزی فکر:

قرآنی نظام فکر (Ideology) میں توحید الٰہی مرکزی نقطہ ہے جس کا خلاصہ سورۃ اخلاص میں دیا گیا ہے۔ یہ مرکزی فکر کسی خاص محدود معاشرے کی تنظیم کے لئے نہیں بلکہ ساری نوع انسانی کی تنظیم کے لئے ہے۔ یہ فکر ایک اور مقام 'آیت الکرسی' میں بھی دیا گیا ہے لیکن وہاں کا طرز بیان اونچے درجے کے سوچنے والے طبقے کے لئے

---

[1] یہ اقلیت امام ولی اللہ دہلویؒ کے فکر پر کام کرنے والوں کی ہے اس جماعت کے کارکنوں نے پہلے 1826ء میں پشاور کو مرکز بنا کر کام کرنا شروع کیا اور کوشش کی کہ سکھوں سے پنجاب چھین کر دہلی پر قبضہ کریں۔ اور امام ولی اللہ دہلویؒ کے فکر پر جمہوریت قائم کریں۔ لیکن یہ جماعت 1831ء میں بالاکوٹ کے حادثے میں شکست کھا گئی، اس کے بعد اس کے کارکنوں نے انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کے لئے 1915ء میں افغانستان اور ترکی کے فوجی اتحاد کی کوشش کی، لیکن ان کا یہ پروگرام بھی پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکا البتہ وہ انگریزوں کو جزوی شکست دینے میں کامیاب ہو گیا، اس کے بعد اس پارٹی کے ایک نامور انقلابی کارکن مولانا عبیداللہ سندھیؒ (1872-1944ء) نے 1926ء میں استنبول (ترکی) سے تقسیم ہند کا پروگرام شائع کیا۔ جسے یورپ میں خوب اشاعت دی گئی۔

ہے۔ "سورۂ اخلاص" میں اسی فکر کو اوسط درجے کے انسانی ذہنوں کی رعایت رکھ کر بیان کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ سورت بے نظیر ہے۔

اعلان بیزاری :

قرآنی انقلاب کی ابتدائی منزل کی تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں اس انقلاب کا ظہور ہوا۔ مخالف لوگوں کا فکر شرک پر مبنی تھا، قرآن نے پہلے تو اپنی جماعت کی جداگانہ مستقل شخصیت مخالفین سے منوائی اور اعلان کیا: "اے لوگو! جو میرے نظام فکر کا انکار کرتے ہو میں (کسی) اس چیز کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم کرتے ہو اور نہ تم اس (ذات واحد) کی عبادت کرتے ہو جس کا میں پرستار ہوں۔ (ایسے ہی)، نہ میں (کبھی) ان کی پوجا کروں گا جن کی تم کرتے ہو اور نہ تم اس ذات کی عبادت کرو گے جس کی میں کر رہا ہوں (اس لئے) تمہارا مسلک حیات الگ ہے اور میرا مسلک حیات الگ ہے۔" (سورۂ کافرون نمبر ۱۰۹)

جنگ :

اس اعلان مبارزت کے بعد جنگ چھڑ جانی ناگریز تھی۔ چنانچہ اس کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے مکہ مکرمہ کے بین الاقوامی، پُرامن شہر) کو چھوڑ کر مدینہ منورہ کو مرکز بنایا گیا۔ اس میں بہت سے سیاسی اور نفسیاتی فائدے پوشیدہ تھے۔ اس کے بعد جنگ "بدر" (۲ھ) سے جو سلسلہ شروع ہوا وہ آخر فتح مکہ (۸ھ) پر ختم ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ :

(ا) مخالفین کی سیاسی شکست : "جب اللہ کی مدد اور فتح آ گئی تو، تو نے دیکھا کہ لوگ جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہونے لگے" (سورۃ النصر : ۱۱۰) یہ مخالفینِ انقلاب کی فوجی اور سیاسی شکست تھی۔

(ب) مخالفین کی اقتصادی شکست : اس کے بعد مخالفین کو اقتصادی (Economic) اور معاشرتی (Social) شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ قرآن حکیم فرماتا ہے : "ابولہب کے (جو اسلام کی مخالف پارٹی کا گویا مہاجن (Prananerer) تھا) دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے اس کا مال اور اس کی کمائی کسی کام نہ آئی"۔ (سورۂ لہب)

(ج) مخالفین کی فکری شکست : (ا) سورۂ اخلاص ۱۱۲ : قرآنی انقلاب کے مخالفین کی سیاسی اور اقتصادی شکست کے نتائج کی تکمیل کے لئے قرآن حکیم نے اپنے نظریہ توحید کا اس زور سے پروپیگنڈہ کیا کہ عرب کی مشرکانہ ذہنیت بالکل برباد ہو گئی اور قرآنی ذہنیت ان پر غالب آئی۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کا مشرکانہ ذہنیت کی طرف لوٹنا ناممکن ہو گیا۔ چنانچہ قرآن حکیم کہتا ہے کہ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ (المائدہ: ۵: ۳) یعنی اب تمہارے نظام حیات

کے منکر (کافر) اس بارے میں قطعاً مایوس ہو چکے ہیں کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر لیں گے۔
خالق کے متعلق فکر کو اس طرح صاف کرنے کے لئے کہ شرک کی گنجائش مطلق باقی نہ رہے قرآن حکیم کی یہ سورت نہایت جامع ہے۔

(۲) سورۂ فلق (۱۱۳) :

سورۂ اخلاص میں جس توحید باری کا ذکر کیا گیا ہے اس کا پھیلاؤ تمام کائنات میں دیکھنا ضروری ہے۔ اگر ایک عقل مند انسان ساری کائنات کو اپنے نظریۂ توحید پر منطبق کرلے تو وہ توحید میں پختہ ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ توحید کو کائنات کو ساتھ جمع نہ کرسکے یعنی وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ ساری کائنات کے وجود کا ایک ایک ذرہ کس طرح ایک وجود اقصیٰ (Ultimte Being) سے آیا ہے اور ساری کائنات میں ایک ہی ذہن عالی (The Great Mind) کی تدبیر کس طرح کام کر رہی ہے؟ تو اس کی توحید آج ہے تو کل نہیں ہو گی۔

(۳) سورۃ الناس (۱۱۴) :

کائنات میں بے شمار اشیاء موجود ہیں۔ بعض اپنی چھوٹائی میں حیرت انگیز ہیں جیسے سالمہ (Atom) اور منفی برقیہ (Electron) ۔ بعض اپنی بڑائی میں حیرت انگیز ہیں جیسے سحابے (Nebulae) اور کہکشائیں (Galaxies)۔ خود کائنات اپنی وسعت اور تنظیم و ترتیب کے اعتبار سے نہایت ہی حیرت انگیز ہے لیکن اس سے بھی اوپر انسان کا ذہن (Mind) ہے جو ساری کائنات میں سب سے زیادہ حیرت ناک چیز ہے۔ وہ اس کائنات کا تصور کرتا ہے اور اس کا راز معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اپنی اَنا (Ego) کو نوع میں منحصر سمجھتا ہے، اس لئے اگر اس کے نوع میں خدا تعالیٰ کی توحید کا اثر و نفوذ پوری طرح سے سمجھ میں آجائے تو یہ عقیدہ مکمل طور پر پختہ ہو جاتا ہے۔

ان سورتوں میں توحید کے نظریے کی تکمیل کی گئی ہے اس لحاظ سے یہ سورتیں سورۂ اخلاص کا تتمہ ہیں۔
وہ فلسفہ توحید جس نے انقلاب کے ذریعہ سے شرک کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دیں، ان تین سورتوں میں مکمل ہو گیا ہے۔ اب یہ تعلیم ہے اور رسول اکرم ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کا عملی نمونہ۔ جب تک نوع انسانی کرۂ زمین پر قائم ہے اس تعلیم سے رسول اکرم ﷺ اور آپ کے قریبی ساتھیوں کا نمونہ سامنے رکھ کر پورا پورا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

سورۃ الاخلاص

ثَنَوِیّت کا رَدّ:

(۱) قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ (تو کہہ دے کہ اللہ ایک ہی ہے)۔ دنیا میں دو قسم کی جماعتیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) وہ جماعتیں جو کسی دین کی پابند ہیں اور (۲) وہ جماعتیں جو کسی دین کی پابند نہیں ہیں۔

جب کوئی قوم اپنے بلند ترین انسانی نصب العین (دین) سے گر جاتی ہے تو اس میں شرک پیدا ہو جاتا ہے۔ غیر مذہبی جماعتوں میں شرک عموماً ثنویت (Dualism) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کوئی فلسفی جماعت یہ تسلیم نہیں کرتی کہ خیر اور شر ایک ہی مرکز سے نکل سکتے ہیں۔ وہ ان کے لئے جدا جدا مرکز مان لیتی ہے۔ جیسے زرتشت کی جماعت نے جو شروع شروع میں مذہبی جماعت تھی، جب فلسفیانہ مسلک اختیار کر لیا تو اس نے خیر کا ایک مرکز مانا اور اسے 'اہورمزد' یا 'یزدان' کہا اور شر کا دوسرا مرکز قرار دیا اسے اہرمن کہا۔ یہ اہلِ فلسفہ اس نکتے کو نہ سمجھ سکے کہ خیر اور شر ایک مرکز سے کس طرح صادر ہو سکتے ہیں۔

حالانکہ وہ اس مسئلے پر کائنات گیر ذہن سے غور کرتے تو وہ تصور کر سکتے تھے کہ کائنات کی ہر ایک چیز اپنی جگہ مفید ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ایک نوع کے لئے مفید ہے اور دوسرے کے لئے غیر مفید یا مُضر۔ کون نہیں جانتا۔

اس لئے کسی شے کو شر مطلق (Absolute Evil) کے ذیل میں لانا غلط ہے اس طرح ہر ایک شے کا وجود ایک مرکز سے ماننا حکمت عالیہ کی رو سے نہ صرف جائز بلکہ لازم ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اعلان کیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ ہی کا ایک وجود ہے جو کائنات کے ایک ایک ذرے کا مصدر ہے۔ ایسے ہی کائنات میں جو تدبیر جاری ہے اس کے پس منظر میں بھی اس ذات واحد ہی کا ذہن عظیم کارفرما ہے۔

شفاعت کے غلط پہلو کا ردّ:

(۲) اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ (اللہ بے نیاز ہے) مذہبی جماعتیں مرکزی طاقت تو ایک ہی تسلیم کرتی ہیں۔ لیکن جب وہ

شرک میں مبتلا ہو جاتی ہیں تو بعض ذیلی طاقتیں ایسی بھی مان لیتے ہیں جنہیں مرکزی طاقت چھوڑ نہیں سکتی۔ ان ذیلی طاقتوں کے تقاضوں کو ماننا مرکز کے لئے ضروری سمجھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک انسان پیدا کیا اسے اپنے قرب کا درجہ عطا فرمایا۔ اب وہ شفاعت کرے تو اسے رد نہیں کیا جائے گا۔ (یعنی خدا تعالیٰ اسے رد نہیں کر سکتا) اس آیت میں اسی قسم کے مشرکانہ فکر کا رد کیا گیا ہے [1] اور بتایا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر شے سے بے نیاز ہے کوئی انسان کتنا ہی معزز کیوں نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق کام کرنے پر مامور ہے اس میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی بات بالجبر منوالے۔

ابنیت کا رد:

(۳) لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۙ ۝ ۔ (نہ اس نے کسی کو جنا نہ وہ کسی سے جنا گیا)۔

اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی تجلیات کام کر رہی ہیں، اس کی تجلیات یوں تو ہر ایک انسان کے قلب پر پڑتی ہیں، لیکن جس انسان کے قلب پر ان کا بہت زیادہ اثر ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے براہ راست علوم حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا ایک مکمل نظام موجود ہے۔ ایسے خاص افراد کو انبیاء کہتے ہیں۔ گری ہوئی مذہبی جماعتیں اس نظام کو نہیں سمجھتیں اور خدا کے برگزیدہ بندوں کو خدا کا "بیٹا" کہنے لگ جاتی ہیں۔ [2] حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ خدا کا کوئی بیٹا ہو ہی نہیں سکتا اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہو سکتا ہے۔

بت پرستی کا رد:

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (اور نہ اس کے برابر کوئی ہے) ثَنَوِیّت کا ایک درجہ تو وہ تھا جس میں خیر و شر کے الگ الگ مرکز مان لئے گئے تھے۔ اس کا رد پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔ اس کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ مان لیا جائے کہ کوئی کمزور طاقت ترقی کرتے کرتے اللہ تعالیٰ کے برابر ہو گئی ہے۔ قدیم یونانیوں کا یہی عقیدہ تھا۔ اور ہندوؤں میں بھی اکثر اسی قسم کے افکار پائے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان میں بُت پرستی یا دیوتا پرستی رائج ہو گئی۔ اس آیت میں ان کا رد کیا گیا ہے۔

---

[1] انبیاء کرام خصوصاً حضرت نبی اکرم ﷺ کی شفاعت کا مسئلہ اس سے الگ چیز ہے اس کے متعلق قرآن حکیم میں جگہ جگہ تصریح کر دی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کے اذن (اجازت) سے ہو گی۔ (مرتب)

[2] قرآن حکیم میں آیا ہے وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ۨ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (التوبہ ۹، ۳۰) یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا مسیح، اللہ کا بیٹا ہے۔ (مرتب)

غرض اس مختصر سورت میں :

(۱) ثنویت (۲) شفاعت مطلقہ (۳) اِبنیّت، اور (۴) بُت پرستی یا دیوتا پرستی

کا پورا پورا رد کر دیا گیا ہے اور خدا تعالیٰ کی ذات کے متعلق یہ حقیقت واضح کر دی گئی ہے کہ وہ اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک و ہمسر نہیں۔ وہی وجود کا مصدر مطلق ہے اور اس کی تجلیات کائنات میں کام کر رہی ہیں، ان میں سے ہر ایک امر پر قرآن حکیم کی سورتوں میں مفصل بحثیں آچکی ہیں۔ سورۂ اخلاص گویا ان تمام بحثوں کا خلاصہ (Summary) ہے۔

جن اہل مکہ کا اس سورۃ پر ایمان بن گیا وہ اور کچھ سمجھیں یا نہ سمجھیں وہ قرآن حکیم کے دئے ہوئے توحید کے سبق کو تو کبھی نہیں بھلا سکتے۔ اب ان میں کسی قسم کی بھی مشرکانہ ذہنیت پیدا نہیں ہو سکتی اور اس مشرکانہ ذہنیت کی خاطر جو اقتصادی طاقت پیدا ہو گی وہ عود نہیں کر سکتی اور یہ اقتصادی طاقت جو سیاسی طاقت کی بحالی کی کوشش کرتی ہے وہ کبھی وجود میں نہیں آسکتی۔ اس طرح سے قرآنی ذہنیت عرب میں مستحکم طور پر قائم ہو گئی۔

سورۃالفَلَق

توحید کا پھیلاؤ کائنات میں :

توحید، ایک نظریے کے طور پر بیان کردیئے جانے کے بعد ضروری ہے کہ یہ واضح کردیا جائے کہ یہ اصول توحید ساری کائنات میں کس طرح کارفرما ہے؟ چنانچہ سورۂ فلق میں یہی چیز دکھائی گئی ہے۔

سورت کی تمثیلی شرح :

حجۃالاسلام مولانا محمد قاسمؒ نے اس سورت کے مضامین کو تمثیل کے ذریعے سے واضح کیا ہے۔

(۱) باغبان، ایک پودا لگاتا ہے اس کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو چیزیں پودے کی طبعی دشمن ہیں ان سے پودے کو بچانے کا سامان کرے مثلاً بعض چوپائے سبزی کھاتے ہیں یہ ان کی طبعی غذا ہے۔ ان کی جو طبیعت ہے اس میں پودے کی موت پوشیدہ ہے۔ باغبان کے لئے ضروری ہے کہ وہ پودے کو اس قسم کی چیزوں کے شر سے بچانے کے لئے اس کے گرد باڑ لگادے۔

(۲) پودے کے بڑھنے کے لئے غذا کی ضرورت ہے۔ باغبان وہ بھی بہم پہنچاتا ہے۔ اگر وہ غذا بہم نہ پہنچائے تو پودا اسی طرح فنا ہو جائے گا، جس طرح جانوروں سے نہ بچائے جانے کی صورت میں فنا ہو جاتا۔

(۳) بیرونی آفتیں مثلاً برف، شدید گرمی، بجلی وغیرہ بھی پودے کو ہلاک کرسکتی ہیں۔ باغبان کے لئے ضروری ہے کہ وہ پودے کو ان بیرونی آفتوں سے بھی بچائے۔ اگر وہ پودے کو ان آفتوں سے نہیں بچائے گا تو وہ جس طرح چارپائے کے حملے سے یا غذا کے بہتر نہ پہنچنے سے ہلاک ہو جاتا ہے اسی طرح وہ ان آفات کا شکار ہو کر بھی ہلاک ہو سکتا ہے۔

(۴) ایک شخص کو پودے سے تو کوئی دشمنی نہیں ہے لیکن اس کے مالک سے عداوت رکھتا ہے، وہ اس عناد کی وجہ سے پودے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتا ہے۔ اگر پودے کو اس کی چیرہ دستی سے نہ بچایا جائے تو بھی پودا اسی

طرح سے فنا ہو جائے گا جس طرح پہلی تین حالتوں میں فنا ہو جاتا۔
یہ پودے کی زندگی کی طبعی منزلیں ہیں۔
انسان کو ایک پودا مان لیا جائے تو اسے بھی ان چاروں قسم کی آفتوں سے بچانے کی ضرورت ہو گی۔ انہیں ذہن میں رکھ کر خدا تعالیٰ سے دعا کی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انسان کی بدنی قوتوں کو جس قدر نقصانات پہنچ سکتے ہیں ان سے محفوظ رہنے کی تدبیر کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں منحصر کر دیا جائے۔

دفع مضرت کی ضرورت :

انسان کا جو تعلق کائنات سے ہے اس کے دو رخ مقرر کئے جا سکتے ہیں۔
(۱) انسان کو اس عالم کی چیزوں سے فائدہ پہنچتا ہے۔
(۲) انسان کو اس عالم کی چیزوں سے نقصان پہنچتا ہے۔
جب ایک عقل مند انسان ان دونوں پہلوؤں پر غور کرنے بیٹھے گا تو وہ سمجھ لے گا کہ انسان کو کائنات سے جو نقصان پہنچ سکتا ہے، اس سے بچاؤ کی تدبیر پہلے سے ہونی چاہئے۔ دفع مضرت کے سلسلے میں کائنات کے ساتھ انسان کے جو تعلقات ہیں وہ منضبط کر لئے جائیں اور ان میں ہر جگہ خدا تعالیٰ کی تدبیر کو کارفرما مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ انسان کا جس قدر تعلق کائنات کے ساتھ ہے اس کے ہر ایک حصے میں خدائے وحدہ لاشریک کی تاثیر کام کر رہی ہے اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہی انسان کو ہر ایک قسم کے شر سے بچا سکتا ہے۔
اس سے آگے بڑھ کر ایک عقل مند انسان سوچتا ہے تو یہ اثر خود بخود اس کے ذہن میں آ جاتا ہے کہ کائنات سے جو منفعت انسان کو پہنچ سکتی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے دست قدرت میں ہے۔
اس طرح کائنات کے تمام اجسام میں اللہ تعالیٰ کی تاثیر و تدبیر کا ایک نمونہ ہمارے ذہن میں آ جاتا ہے اور انسان اپنے بدن کی سلامتی کو دیکھ کر کائنات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کارفرمائی کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی سورۂ فلق کا موضوع ہے۔ اب ہم اس مثال کے مطابق اس سورت پر غور کرتے ہیں۔

عمل انفلاق اور اس کی ہمہ گیری :

(۱) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ ① ۔ (کہہ دے کہ میں، چیر کر پیدا کرنے والے رب کی پناہ میں آتا ہوں)
تمام مادی اشیاء کی تخلیق میں عمل انفلاق (Fission) کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ عمل ساری کائنات میں جاری

ہے۔ خود کائنات کے متعلق حکماء کی تحقیق یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی ایک بہت بڑے انفلاق (Explosion) سے شروع کی۔ اس کے نتیجے کے طور پر سحابے (Nebulae) وجود میں آئے۔ اور پھر ان کے انفلاقات سے تمام ستارے (سورج) پیدا ہوئے۔ ان میں سے ہمارے سورج کے انفلاق سے سیارے بنے جن میں ہماری زمین بھی شامل ہے اس کے بعد زمین کے کسی انفلاق سے ہمارا چاند وجود میں آیا۔

اسی طرح سے اعضاء والے جانداروں (Organisms) میں خلیات (Cells) کے پھٹنے (Fission) سے مرکب ابدان پیدا ہوتے ہیں۔ تمام حیوانات میں خلیات کے پھٹنے سے ہی نشوونما کا عمل ہوتا ہے اور دانے اور گٹھلی کے پھٹنے سے ہی پودے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لئے قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کو فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی (دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا) بتایا گیا ہے۔

عمل انفلاق کے عالمگیر نظام کے خالق کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی ہمہ گیر تدبیر اور کائنات گیر قدرت کا اس سے بہتر تصور نہیں دیا جاسکتا، جیسا اس آیت میں دیا گیا ہے۔ پھر یہ عمل انفلاق محض تخریبی نہیں ہے بلکہ تعمیری بھی ہے اور نظام ربوبیت کا مددگار ہے۔ اس حیثیت سے بھی نظام انفلاق کی عظمت اس بات کی دلیل ہے کہ خدا تعالیٰ ہی ہر قسم کے شر سے پناہ کا مرکز بن سکتا ہے۔

(۱) پہلا شر: مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ۙ ۝ ۔ (ہر ایک چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی)۔

جس چیز کی مخلوقیت میں انسان کے لئے شر ہے (جیسے سانپ بچھو وغیرہ) اس کے شر سے بچنے کے لئے رَبُّ الْفَلَقْ کی پناہ میں آتا ہوں۔

یہ پودے کی زندگی کی وہی منزل ہے جب اسے ان چیزوں سے خطرہ لاحق ہوتا ہے جن کی طبیعت میں پودے کے لئے شر ہے۔

(۲) دوسرا شر: وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ ۙ ۝ ۔ (اور اندھیری رات کے شر سے جب وہ چھا جائے)۔

جب چاند غروب ہو جاتا ہے اور رات تاریک ہو جاتی ہے۔ اس کی روشنی سے پودے کو جو فائدہ پہنچتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے ایسے ہی انسانیت کو "غذا" پہنچانے والی جتنی چیزیں ہیں مثلاً صحیح علم، علم کے مطابق عمل کا صحیح نمونہ۔ ان کے فقدان سے جو نقصان انسان کو پہنچ سکتا ہے وہ ہماری اس مثال کے کُلئے میں آجاتا ہے۔

ہمیں تمام ایسی چیزوں اور سامانوں کے نہ ملنے سے جن سے ہماری انفرادی، اجتماعی اور نوعی پرورش ہوتی ہے اور جس قدر نقصان پہنچ سکتا ہے اس سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتے ہیں۔

(۳) تیسرا شر: وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ ۙ ۝ ۔ (اور گرہوں میں پھونکیں مارنے والیوں کے شر سے)۔

نفث : پھونک مارنا : نفاثات پھونکیں مارنے والیاں۔ یہ مؤنث کا صیغہ ہے، یہ جماعت کے لئے بھی آتا ہے۔ اکثر مفسرین اتنی ہی بات کہہ کر خاموش ہوگئے کہ عورتیں جو پھونکیں مار کر جادو کرتی ہیں۔ یہ اس عمل کی ایک مثال ہے اس کی دوسری مثال جماعتیں بھی ہوسکتی ہیں۔

عقد :

عقدۃ، عُقَد (گرہ) کی جمع ہے۔ اگر نفاثات سے مراد عورتیں لی جائیں تو 'عقد' سے مراد "دھاگے میں لگائی جانے والی گرہیں" ہوسکتی ہیں۔ اگر اس سے مراد جماعتیں لی جائیں تو 'عقد' سے مراد "پختہ خیالات" ہوں گے، جنہیں انسان گرہ باندھتا ہے۔ یہ اس کا عقیدہ یا ایمان ہوتا ہے، جو اس کے وجود کے ساتھ اس طرح پیوست ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوسکتے۔ تمام انسانی ترقی اسی نکتے کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایمانی قوت جتنی مضبوط ہوگی اتنا ہی انسان کی ہمت اور ارادہ مضبوط ہوگا۔ اور وہ اتنا ہی مضبوط اور دیرپا کام کرسکے گا۔

پراپیگنڈا کرنے والی ایک جماعت پراپیگنڈا کرتی ہے، وہ ایک فکر لوگوں کے کانوں میں پھونکتی اور ان کے دلوں میں ڈالتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سننے والوں کا اپنا عقیدہ رفتہ رفتہ اس سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ اس طرح مخالف پراپیگنڈا کرنے والی جماعتیں اپنے پراپیگنڈا کے زور سے انسان کے زندگی بخش پروگراموں کو نکما ثابت کرکے ایک انسانی معاشرے کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہیں۔

آج کل پراپیگنڈے کی طاقت توپ و تفنگ کی طاقت سے زیادہ مانی گئی ہے۔ ایام جنگ میں 9/10 طاقت پراپیگنڈہ (Cold war) یا (war of Nerves) کی تسلیم کی گئی ہے اور 1/10 آلات کے ذریعے جنگ (Hot war) کی، جس میں معمولی بندوق سے لے کر انتہائی مہلک آلات تک سب داخل ہیں۔

انسانی معاشرے کی فکری زندگی کے لئے پراپیگنڈے کا وہی اثر ہے جو پودے کے لئے برف وغیرہ کا۔

(۴) چوتھا شر : وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ۝ (اور حاسد کے شر سے جب وہ حسد کرے)۔

ایک شخص کو ایک نعمت دی گئی ہے، اس کا حاسد یہ نہیں چاہتا کہ اس شخص کے پاس وہ نعمت رہے لیکن مجھے اس سے بڑھ کر مل جائے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ مجھے وہ نعمت یا اس سے اعلیٰ تر نعمت ملے یا نہ ملے لیکن اس شخص کے پاس یہ نعمت نہ رہے۔

چیزوں کی تقسیم، الٰہی قانون کے مطابق ہوتی ہے، اس کی حکمت جسے جو دینا مناسب خیال کرتی ہے عطاء فرمادیتی ہے۔ جو شخص کسی ایسے شخص سے دشمنی کرتا ہے جسے کوئی نعمت دی گئی ہے، وہ اصل میں نعمت تقسیم

کرنے والے پروردگار "المُعطی" سے دشمنی کرتا ہے۔ محسود کے ساتھ اس کی براہ راست کوئی عداوت نہیں ہوتی۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے باغ کے مالک سے دشمنی کرنے والا اپنی دشمنی پودے پر نکالے۔

ایسے شخص سے بچنے کے لئے میں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں۔

نتیجہ :

اس مختصر سی سورت میں ان تمام شرور کا ذکر آگیا ہے، جن سے انسان کو اپنی ترقی کے لئے بچنے کی ضرورت ہے۔ توحید کا عقیدہ ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ انسان اپنی جسمانی سلامتی کی خاطر ہر قسم کی مضرت سے بچنے کے لئے خدا تعالیٰ کی پناہ میں آجائے۔ اس کے ساتھ یہ تصور خود بخود انسان کے ذہن میں آجاتا ہے کہ خدا تعالیٰ ساری کائنات پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔ اور وہ نہ صرف یہ کہ انسان کو ہر ایک شر سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ 'بلکہ ھر قسم کا شر بھی انسان کو پہنچا سکتا ہے لیکن وہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت سے ہی پہنچ سکتا ہے بلکہ کائنات کی کسی شے سے انسان کو جو فائدہ پہنچ سکتا ہے اس تصور سے ہر ایک بچے، بوڑھے اور مرد و عورت کے دماغ میں قدرت الٰہی کی وسعت بیٹھ جاتی ہے۔

اتنا بڑا علم اتنے مختصر الفاظ میں ایسے عام فہم انداز اور مقرون اشیاء کے ذریعے سے بیان کرنے کی مثال قرآن حکیم کے سوا اور کسی جگہ تلاش کرنا بے سود ہے ! !

سُورۃالناس

توحید کا پھیلاؤ نوع انسانی میں :

کائنات یا شخص اکبر (Macrocosm) کے اندر توحید کا پھیلاؤ دکھانے کے بعد ضروری ہے کہ خود نوع انسانی کے اندر اس فکر کا پھیلاؤ دکھایا جائے۔ انسان کو شخص اصغر (Microcosm) کہا جاتا ہے۔ وہ مجموعی طور پر کائنات کا نمائندہ ہے۔ وہ کائنات کی سب سے بڑی شخصیت ہے۔ اس کا ذہن کائنات کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور حیرت ناک چیز ہے اور اس کا انا (Ego) سب سے زیادہ مؤثر اور ہمہ گیر ہے۔ اس لئے اس کے اندر توحید کا پھیلاؤ دکھانا زیادہ ضروری ہے۔ کائنات کے وسیع دائرے کے اندر انسانیت کا دائرہ چھوٹا سہی، لیکن یہ سب سے اہم دائرہ ہے۔ اس کا مرکز بھی وہی توحید خالص ہے جس کا ذکر سورۂ اخلاص میں آچکا ہے۔ اس انسانی دائرے میں انسانی اجتماعیت کا اہم ترین مقام ہے جو تمام آسمانی شریعتوں کا موضوع (Subject) ہے لیکن اسلام تمام شرائع کو ایک نظام میں جمع کرتا ہے۔ اس لئے اس سورت میں نوع انسانی کے دائرے کے اندر توحید باری کو جس وسعت سے بیان کیا گیا ہے وہ اسی کتاب عظیم کا حصہ ہے۔

تمام ادیان عالم میں سے صرف اسلام اجتماعیت انسانی کے درجہ کمال پر بحث کرتا ہے۔ قرآن حکیم کی پیش کردہ اجتماعیت تین اہم مرکزی (Concentric) دائروں میں گھومتی ہے۔ یعنی :

(۱) دائرۂ ربوبیت (۲) دائرۂ ملوکیت (۳) دائرۂ الوہیت

(۱) دائرہ ربوبیت :

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ ① ۔ (کہہ دے کہ میں تمام انسانوں کی ربوبیت کرنے والے کی پناہ میں آتا ہوں)۔

سورۂ فلق کی تشریح میں پودے کی جو تمثیل اختیار کی گئی تھی، اسے آگے بڑھائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان

پودے کی طرح پیدا ہوتا ہے اور نشو ونما پا کر اپنے جیسے اور "پودے" پیدا کرتا ہے اور ان کی تربیت کرتا ہے۔

انسان اپنے آباؤاجداد کو دیکھتا ہے کہ انہوں نے اس کی تربیت کی پھر وہ خود اپنے آپ کو اپنی اولاد کی تربیت کرتے پاتا ہے گویا اس کے خاندان کے اندر "ربوبیت" کا ایک نظام موجود ہے، لیکن قرآن حکیم انسانوں پر یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا ہے کہ ربوبیت کا یہ عمل کسی ایک خاندان کے اندر محدود نہیں ہے یعنی یہ دائرہ اتنا تنگ نہیں کہ ہمارے آباؤاجداد ہماری پرورش کر کے ختم ہوگئے اور ہم اپنی اولاد کی پرورش کر کے ختم ہو جائیں گے۔ بلکہ کوئی نظام ایسا ہے جو ساری نوع انسانی کی ربوبیت کر رہا ہے۔ وہ ذات جو ساری نوع انسانی ہی کی نہیں بلکہ ساری کائنات کی ربوبیت کر رہی ہے حقیقی معنوں میں 'رب' ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے آباؤاجداد اپنے آباؤاجداد کی ربوبیت کے محتاج تھے۔ ہم اپنے آباؤاجداد کے دست نگر تھے اور اب ہماری اولاد ہماری ربوبیت کی محتاج ہے۔ یہی سلسلہ دیگر حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کرۂ زمین پر ہر جگہ ربوبیت عامہ کے آثار موجود ہیں، بلکہ نوانسانی کی تخلیق سے بھی پہلے سے یہ سلسلہ جاری ہے، اس سلسلہ ربوبیت کی تخلیق وتدبیر میں نہ ہمارے آباؤاجداد کا ہاتھ ہے نہ خود ہمارا نہ ہماری اولاد کا۔ ربوبیت عامہ کا یہ نظام اتنا وسیع ہے اور اس کی تدبیر اتنی پیچیدہ ہے کہ عقل مند سے عقل مند انسان بھی ابھی تک ربوبیت کے اس نظام کا پورا اندازہ نہیں لگا سکا اور یہ ربوبیت کسی ایک زمانے یا خطے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے وہ مکان یا زمان کی پابند نہیں ہے۔ اسے دیکھ کر انسان کی فطرت سلیمہ تقاضا کرتی ہے کہ ایک "رب مطلق" کی ہستی کو تسلیم کرے اور پھر اس کا جو تعلق انسانیت عامہ کے ساتھ ہے وہ متعین کر کے اپنی "ربوبیت" کو اس کی ربوبیت عامہ کا پرتو سمجھے اور اپنے آپ کو "رب العالمین"۔ "رَبُّ النَّاس" کا خلیفہ جانے۔ اسی میں انسانیت کا شرف ہے اور یہی اس کی ترقی کا راستہ ہے۔

(۲) دائرہ ملوکیت :

(۲) مَلِكِ النَّاسِ ۝ ۔ (لوگوں کے بادشاہ حقیقی کی پناہ میں آتا ہوں۔)

انسان کی ارتفاقی زندگی (Cultural Life) کی ترقی میں ایک منزل آتی ہے جب وہ دیہاتی زندگی (ارتفاق اول) [1] اور قصباتی زندگی (ارتفاق دوم) [2] سے بلند تر ہو کر شہری زندگی (ارتفاق سوم) [3] اختیار کرتا ہے اس منزل

---

[1] (۱)، (۲) اور (۳) امام ولی اللہ دہلوی (۱۷-۱۷۶۳) کی اجتماعیت (Sociology) میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسان جب حیوانیت سے اوپر اٹھ کر انسانیت میں داخل ہوتا ہے تو وہ پہلے چھوٹے چھوٹے دیہات بنا کر رہتا ہے جن میں کاشتکاری، چند برتنوں کا استعمال، زبان کا استعمال، لباس اور مکان کا استعمال کرتا ہے اور تعین

پر پہنچ کر وہ معاشرے میں حکومتی نظام پیدا کرتا ہے تاکہ اس میں عدل قائم کرے۔

یہ عدل جب انسانی زندگی کے معاشی اور اقتصادی شعبوں کا انتظام کرتا ہے تو ربوبیت کی شکل اختیار کرتا ہے اور جب سیاست کے شعبے میں کام کرتا ہے تو ملوکیت بن جاتا ہے۔ یہ دونوں دائرے ایک دوسرے پر منطبق ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے میں معاشی عدل اور سیاسی عدل انہی بنیادوں پر قائم ہونا چاہئے جن بنیادوں پر یہ عدل خاندان میں قائم ہوتا ہے یعنی جس طرح ماں باپ اپنے بچوں کو غذا بہم پہنچاتے ہیں ان کی تعلیم و تربیت اور صحت و تفریح کا سامان کرتے ہیں ان کی غلطیوں پر رحم آمیز عدل (Justice tempered with mercy) سے ان کی سیاست کرتے ہیں ایک اچھی حکومت بھی اسی طرح کرتی ہے۔ اس کا نظام ربوبیت اور نظام عدل پورے معاشرے میں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جب حکومت اس بلند معیار سے گر جاتی ہے اور معاشرے میں ظلم و طغیان سر اٹھاتا ہے تو معاشرے میں سے انقلابی قوتیں ابھرتی ہیں اور وہ اس نظام کو برباد کر کے نیا نظام قائم کر لیتی ہیں۔ ❶

ایک عقل مند انسان، اجتماع انسانی میں مرکزی مقام حاصل کر لے تو وہ اپنی "ملوکیت" اور اس کی حد بندیوں پر غور کرے گا تو دیکھے گا کہ ساری کائنات ایک مستقل نظام تدبیر میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ نظام فطری قوانین پر مشتمل ہے جن کا اثر و عمل نہایت وسیع اور ناقابل تبدیل ہے۔ وہ اس نظام فطرت کو توڑنے کی طاقت اپنے اندر نہیں پاتا۔ ان قوانین میں ایک مکمل ربط اور انکے عمل میں یکسانیت ایک برتر حکیمانہ قوت کے وجود کی طرف اشارہ کرتی ہے، جو ساری کائنات کو چلا رہی ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ اپنی ملوکیت کو اس "مَلِكُ النَّاسِ" کی ملوکیت کا سایہ پاتا ہے اور اپنا شرف اسی میں سمجھتا ہے کہ خود کو اس شہنشاہ مطلق کا خلیفہ قرار دے کر اس کے احکام کو انسانی معاشرے میں نافذ کرے۔ یہ جذبہ ایک دانش مند اجتماعی انسان کے اندر ضرور ظاہر ہوتا ہے اور ترقی کرنے والا انسان وہی ہوتا ہے جو اجتماعیت پسند ہو۔ ❷

قرآن حکیم واضح دلائل سے ثابت کرتا ہے کہ حکومت اور ملوکیت حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی کو سزاوار ہے۔

زوجہ کرتا ہے۔ اس منزل میں اس کی تخلیقات میں صفائی اور حسن کم ہوتا ہے اسے امام صاحب ارتفاق اول (The First Stage of Human Culture) قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ بڑے بڑے قصبات آباد کرتا ہے اور ارتفاق اول کی چیزوں میں صفائی اور حسن کا اضافہ کرتا ہے اسے وہ ارتفاق دوم (The second Stage of Human Culture) جب وہ سیاسی قوموں میں بٹ گیا اور ان میں خونریزیاں ہونے لگیں تو بین الاقوامی حکومتیں قائم ہونے لگیں تاکہ قوموں کو ان خونریزیوں سے روکا جائے۔ یہ بقول امام صاحب انسانی ترقی کی چوتھی اور آخری منزل۔ یا ارتفاق چہارم (The Fourth Stage of Human Culture) قرار دیتے ہیں۔ اس سے آگے ترقی کر کے وہ معاشرے میں نظام حکومت قائم کرتا ہے۔ یہ ارتفاقات کی تیسری منزل ہے۔

❶ جب کسی معاشرے میں سے انقلابی طاقت ختم ہو جاتی ہے اور وہ ظلم و طغیان کو برداشت کرنے لگ جاتا تو رفتہ رفتہ اسے بربادی کا عذاب آلیتا ہے۔ (مرتب)

❷ ایک انسان اپنی ضرورتیں پوری طرح سے محسوس کرتا ہے لیکن وہ اپنی ذاتی طاقتوں کے استعمال سے یہ ضرورتیں پوری نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے ساتھ ایک جماعت جمع کر لیتا ہے جس کی مدد سے اس کے مطلب پورے ہونے لگتے ہیں ایسا انسان اجتماعی انسان کہلاتا ہے۔ (مرتب)

دوسرے تمام حکمران اس کے محتاج ہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بُتان آذری

اس کی ملوکیت کا حلقہ اتنا ہی وسیع ہے جتنا اس کی ربوبیت کا۔ یہ بات سمجھ لینے کے بعد اس کا نتیجہ سمجھ لینا چنداں مشکل نہیں رہتا اور وہ یہ کہ انسان اپنے معاشرے میں اپنی مطلق العنان حکومت قائم کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس لئے انسانی معاشرے میں فقط شورائی نظام حکومت ہی قائم ہو سکتا ہے۔

(۳) دائرہ الوہیت :

اِلٰهِ النَّاسِ ۙ ۝۔ (میں انسانوں کے معبود حقیقی کی پناہ میں آتا ہوں)۔ انسانی اجتماع میں یہ تیسرا دائرہ ہے۔ یہ بھی پہلے دو دائروں، ربوبیت اور ملوکیت پر منطبق ہوتا ہے۔

الوہیت، سے مراد دلوں کو کھینچ لینے والی وہ محبوبیت ہے جو عشق تک بلکہ اس سے بھی آگے پہنچ جائے۔

انسان کے اندر حُب کا ایک جذبہ موجود ہے وہ اصل میں علم ہی کی ایک شاخ ہے۔ انسان کو کسی ذات میں چند خوبیاں نظر آتی ہیں جو اسے اپنی طبیعت کے مناسب محسوس ہوتی ہیں۔ اس لئے وہ اپنے دل میں اپنے محبوب کے لئے ایک کشش کا باعث ہوتا ہے۔

جب انسان کائنات پر غور کرتا ہے تو اس میں ہر جگہ حسن و جمال کا ظہور پاتا ہے اور جب وہ نوع انسانیت کی ترقیات کا جائزہ لیتا ہے، تو وہ ان میں حسن اور احسان دونوں کی وسیع علامات پاتا ہے وہ رفتہ رفتہ ان کی بپتا کرتا ہوا ایک ایسی ذات تک پہنچ جاتا ہے، جو کائنات اور نوع انسانی کے اندر حسن و احسان کی مرکز ہے۔ وہ اس ذات کے لئے اپنے قلب کے اندر ایک کشش پاتا ہے اور پھر اسی کا ہو رہتا ہے۔

انسان جب اللہ تعالیٰ کی مذکورہ بالا صفات "رَبِّ النَاس" اور "مَلِكِ النَّاس" کے رنگ میں جا کر معاشرے میں کام کرتا ہے، تو لامحالہ اس کی "ربوبیت" عام ہوتی ہے اور اس کے عدل کا دائرہ اس کی "ربوبیت" کے دائرے کے برابر ہوتا ہے، یعنی وہ صرف اپنی اور اپنے خاندان کی تربیت نہیں کرتا بلکہ سارے انسانی معاشارے کی "ربوبیت" کا نظام سوچتا ہے۔ وہ صرف اپنے خاندان کے اندر عدل قائم کرنا نہیں چاہتا، بلکہ سارے انسانی معاشرے کے لئے معاشرتی اور معاشی عدل قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سارے انسانی معاشرے کا مرکز محبت بن جاتا ہے۔ ایسے ہی جو جماعت اس طرح سے کام کرے وہ بھی انسانی معاشرے میں محبوبیت حاصل کر لیتی ہے۔ وہ سارے انسانی معاشرے کو اپنا خاندان تصور کر کے اس کی خدمت کرتی ہے یہ ہے انسانی فطرت۔

ایک اجتماعیت پسند انسان جس طرح ربوبیت کے عالمگیر نظام کو دیکھ کر اپنی "ربوبیت" کو "رَبُّ العَالَمِین" یا "رَبُّ النَّاس" کی ربوبیت کی ذیل میں لے آتا ہے اور ساری کائنات میں باضابطگی اور نظم و نسق کی وسعت کو دیکھ کر اپنی حکومت کو حاکم عَلَی الْاِطْلَاق (مَلِكِ النَّاس) کی ملوکیت کے تابع کر کے اس کی خلافت قرار دے لیتا ہے، اسی طرح سے وہ اپنی محبوبیت کو بھی اللہ تعالیٰ کی محبوبیت میں مدغم کر کے صرف اسی کو محبوب حقیقی قرار دے لیتا ہے، جب حب اس درجے پر پہنچ جاتی ہے کہ انسان اپنے اختیار کو محبوب کے اختیار کے تابع کر دیتا ہے اسے عبادۃ کہتے ہیں اور محبوب کو "الٰہ" کہتے ہیں۔

ایک اجتماعی انسان حب کے اس درجے پر پہنچ کر خدا تعالیٰ کو نہ صرف اپنا الٰہ تسلیم کرتا ہے، بلکہ اسے ساری کائنات کا الٰہ مانتا ہے اور وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی چیز یا انسان سے اعلیٰ درجے کی محبت کرے اور انسانی اختیار کو اس الٰہ واحد کے سوا کسی اور کے تابع کر دے!۔ اس قسم کی ذہنیت، انسانی ملوکیت یا مطلق العنانی کو کبھی قبول نہیں کر سکتی اور اس ذہنیت کا مالک انسان جہاں اجتماعیت پسند ہو گا وہاں وہ حقیقی معنوں میں جمہوریت پسند بھی ہو گا۔ غرض انسان سلامتی فطرت کے ساتھ چل رہا ہو تو وہ اپنی ثقافتی اور ارتقاتی ترقی میں ان تین درجوں میں سے گزرے گا:

وہ اپنے آپ کو دوسروں کا "مربی" بنانے کی کوشش کرے گا۔
وہ اپنے آپ کو دوسروں پر "حاکم" بنانے کی کوشش کرے گا اور
وہ اپنے آپ کو دوسروں کا "محبوب" بنانے کی کوشش کرے گا۔

یہ جذبات ہر ایک انسان میں موجود ہیں۔ اگر اسے صلاحیت اور علم حاصل ہو تو وہ اپنے انہی جذبات کی مثالوں کی روشنی میں کائنات کا مطالعہ کر کے یہ بصیرت حاصل کرے گا کہ انسانیت عامہ کے "رَبّ"، "مَلِک" اور "الٰہ" کو پہچان لے اور پھر اس سے بھی اونچا اٹھ کر اس ذات واحد کی ربوبیت، ملوکیت اور الوہیت کی واضح نشانیاں ساری کائنات میں مشاہدہ کر کے اسے ہی ساری انسانیت اور ساری کائنات کا رب، ملک اور اِلٰہ تسلیم کر لے۔

قرآن حکیم کے نزدیک انسانیت کی ترقی انہی تین کمالات انسانی کی ترقی پر منحصر ہے یعنی انسانیت کی خدمت کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر کے اس کا نائب بنے۔ اس طرح سے انسانیت کے اندر خدا تعالیٰ کی توحید کا مظاہرہ مکمل ہو جاتا ہے۔

(۴) مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ ۝ ۔ (۵) الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۙ ۝

"وسوسہ پیدا کرنے والے چھپ جانے والے کے شر سے جو انسانوں کے دلوں میں وسوسہ پیدا کرتا ہے۔"

وسوسے کی حقیقت :

ان انسانی کمالات کی ترقی کی دشمن کیا چیز ہے؟اس فکر جلیل میں خلل کس طرح پڑتا ہے۔اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کی ذہن میں کسی فکر عظیم کے متعلق کوئی کمزور نقطہ پیدا ہو جاتا ہے اسے وسوسہ کہتے ہیں۔یہی وسوسہ ترقی کر کے شک بن جاتا ہے، جس کا انجام انکار ہوتا ہے۔

انسانی فکر کو بدلنے والی طاقتوں کے دو حصے کر لیجئے۔

(۱) انسانی جماعتیں : انسان کسی سوسائٹی میں رہنے لگے تو اس سوسائٹی کے اثر سے رفتہ رفتہ اس کا فکر تبدیل ہونے لگتا ہے۔اصل میں تو ایک طبقے سے دوسرا طبقہ اثر لیتا ہے، لیکن بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن کے مفادات دو طبقوں میں مشترک ہوتے ہیں۔ایسے انسان ایک طبقے میں متاثر ہو کر اس اثر کو دوسرے طبقے میں منتقل کر دیتے ہیں۔ اس طرح اثرات مختلف طبقوں میں پھیل جاتے ہیں۔

(۲) انسان کے سوا دوسری طاقتیں : ان کے اثر سے بھی انسان کے دماغ کا فکر بدل جاتا ہے۔ یہ ساری طاقتیں ہمارے سامنے نہیں آتیں۔

''وسواس'' کیا ہے؟

عالم مثال میں انسان کا ایک قرین ہوتا ہے، جو یا تو شیطنت کی طرف مائل ہوتا ہے یا ملکیت کی طرف۔ یہ جنّ (پوشیدہ مخلوق) اگر شیطنت کی طرف مائل ہو تو ہمارے افکار میں فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ایسے ہی انسانی جماعتیں اپنے مخالف نظام فکر میں وسوسے ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں، جس کے بہت سے طریقے ہیں۔ان جماعتوں کے کارندے جو بظاہر پراپیگنڈا کرتے ہیں اصل محرک نہیں ہوتے۔اصل محرک ان کے پیچھے ہوتے ہیں جن سے ہم واقف نہیں ہوتے۔ وہ جماعتیں ان کارندوں کو لکھا پڑھا کر ان سے کام لیتی ہیں اور انسان کے فکر میں تبدیلی پیدا کرتی ہیں۔

ہم اپنے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر اس امر کا تجربہ کر چکے ہیں کہ وہ اپنے ذہن کو ہمارے ذہن کی طرف متوجہ کر کے تاثیر ڈالنا چاہتے ہیں، تو ہم پر اثر ہوتا ہے۔صوفیا کے ہاں یہ ایک مستقل فن ہے اسے 'توجہ دینا' کہتے ہیں لیکن نہ ہر ایک صوفی 'توجہ' دے سکتا ہے نہ ہر ایک طالب توجہ لے سکتا ہے۔اس فن کے قواعد واصول ہیں جن کے تحت 'توجہ' دی جاتی ہے۔اس سے طالب کے قلب میں افکار پیدا ہوتے ہیں۔

ایسے ہی ہم نے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی دیکھا ہے۔ وہ بھی فکری تاثیر (Suggestion) ڈالنے

کی طاقت رکھتے ہیں۔ پروپیگنڈا کے ذریعے سے عوام کے دلوں میں خیالات پیدا کرنا تو سب جانتے ہیں اس طرح سے عوام کے افکار میں انتشار پیدا کر دیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز وسوسے ہی سے ہوتا ہے اس طاقت کو جو وسوسہ پیدا کرنے میں مرکزیت کا مقام رکھتی ہے، "وسواسِ" کہا جاتا ہے۔

(٦) مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۝ (جنوں اور انسانوں میں سے)

اس قسم کی وسوسہ پیدا کرنے والی طاقتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(١) وہ طاقتیں جو نظر آتی ہیں اور

(٢) وہ طاقتیں جو نظر نہیں آتیں۔

اول الذکر میں، انسان داخل ہیں اور آخر الذکر میں جن، سفلی اور علوی ملائکہ شامل ہیں۔

دونوں قسم کی طاقتیں ہمارے دلوں میں افکار پیدا کرتی ہیں۔ امر حق کے خلاف جو انتشار فکر پیدا ہوتا ہے، وہ فکری مرض ہوتا ہے، جو رفتہ رفتہ انکار حق تک پہنچ جاتا ہے۔

باطل افکار کا نتیجہ :

یہ باطل افکار کبھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے متعلق ہوتے ہیں۔ کبھی اللہ تعالیٰ کی ملوکیت کے متعلق ہوتے ہیں اور کبھی اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے متعلق ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے متعلق جو باطل افکار پیدا ہوتے ہیں وہ آخر کار دولت کے ارتکاز (Concentration of Wealth) اور پیداوار کے احتکار (Hoarding) پر منتج ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ سرمایہ داری پیدا کرتے ہیں جس سے بقول امام ولی اللہ دہلویؒ انسان کے اخلاق کا فساد پیدا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ملوکیت کے متعلق جو باطل خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ انسانی ملوکیت (Imperialism) پیدا کرتے ہیں، جن میں انسانوں سے ناجائز انتفاع (Exploitation) پیدا ہوتا ہے، اس سے بھی فساد اخلاق پیدا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے متعلق جو غلط خیالات پیدا ہوتے ہیں، وہ شرک پیدا کرتے ہیں، جو انسانیت پر سب سے بڑا ظلم ہے۔ اور یہ تپ دق کی مانند ہے۔ اس سے خدا پرست انسان کا بھروسہ اٹھ جاتا ہے اور وہ اپنی روز مرہ کی زندگی میں ہر ایک طاقت سے مصالحت (Compromise) کرنے کی طرف جھکنے لگتا ہے اور اس طرح اس میں سے انقلابیت (Revolutiony Spirit) نکل جاتی ہے اور رجعت پسندی (Reactionryism) پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بلند نصب العین پر قائم نہیں رہتا اور نہ صالح بین الاقوامی نظام پیدا کر سکتا ہے۔

ایسے ہی ربوبیت الٰہی کے عقیدے میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ تو انسان سماحت [1] کے خُلُقُ سے عاری ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ حرص اور طمع کے امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسا انسان کوئی اعلیٰ درجے کا اجتماعی نظام نہ پیدا کر سکتا ہے نہ چلا سکتا ہے۔

مُلوکیۃ الٰہی کے عقیدے میں فساد پیدا ہو جائے تو انسان معاشرے میں خود "ملک الناس" (انسانوں کا خود مختیار مالک) بن بیٹھتا ہے، جس سے سیاسی تغلب پیدا ہو جاتا ہے اور انسان عدل کے خلق سے عاری ہو جاتا ہے۔

الوہیۃ الٰہی کے عقیدے میں خلل پڑ جائے تو انسان علم کا اجارہ دار بن بیٹھتا ہے۔ اور تقدس کا جامہ پہن لیتا ہے۔ عوام جہالت میں مبتلا ہو کر اپنے جیسے انسانوں کو خدا بنا بیٹھتے ہیں۔ اس طرح انسانیت کے دونوں طبقے اخبات کے خلق سے محروم ہو جاتے ہیں۔

انسانیت کی بربادی:

غرض توحید کامل میں وسوسہ پیدا ہو جانے سے انسان سماحت، عدل اور اخبات کے بنیادی اخلاق سے بالکل عاری ہو جاتا ہے اور ان کی بربادی سے طبعی طور پر طہارت کے خلق پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔ اس طرح انسان اپنی پوری انسانیت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ جس معاشرے سے یہ اخلاق نکل جائیں وہ انسانیت سے محروم ہو کر برباد ہو جاتا ہے۔

انسانیت کو اس بربادی سے بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انسان صرف خدا تعالیٰ ہی کو "رب الناس"، "ملک الناس" اور "الٰہ الناس' تسلیم کرے اور خود معاشرہ انسانی میں خدا تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ بن کر ان صفات الٰہی کا مظاہرہ کرے۔

فکری غلبہ:

جب اللہ تعالیٰ کی توحید کامل یعنی وجود کی وحدت اور تدبیر کی مرکزیت (جس طرح وہ ساری کائنات اور نوع

---

[1] امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے میں انسانیت کی ترقی کا مدار چار قسم کے اخلاق حاصل کرنے میں ہے۔ یعنی طہارۃ، سماحت، اخبات اور عدالت۔ طہارت سے مراد لباس، ماحول اور افکار کی پاکیزگی ہے۔ سماحت سے مراد ہے دنیاوی لذتوں میں انہماک نہ ہونا۔ تاکہ انسان اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے وقت نکال سکے۔ اخبات سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی محبت کے جذبے کا دل میں ہونا، جس کی وجہ سے وہ اس کے احکام کی پیروی کے لئے ہر وقت تیار رہے اور عدالت سے مراد ہے، معاشرے میں سے ہر قسم کا ظلم و طغیان دور کر کے عدل و انصاف قائم کرنا۔ تفصیل کے لئے دیکھو امام صاحب کا رسالہ "ہمعات" "حجۃ اللہ البالغہ" اور "بدور بازغہ" (مرتب)

انسانی میں جاری و ساری ہے) انسان کے ذہن میں بیٹھ جائے اور اپنے علم اور تجربے سے اس کی وسعت اور ہمہ گیری کا کامل یقین پیدا کرلے تو کوئی مشرکانہ تصور انسان کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ اور نہ معاشرے میں ظلم قائم رہ سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے مکہ معظّمہ کی سوسائٹی میں یہ ذھنی انقلاب لاکر اسے شرک اور ظلم سے بالکل پاک کردیا اور پھر مدینہ منورہ کو مرکز فکر و عمل بناکر سارے عرب میں ایک عظیم الشان ذھنی، سیاسی، اقتصادی اور اجتماعی انقلاب مکمل کرلیا۔ جس کا اثر حدود عرب سے نکل کر رب المشرق والمغرب (شرق و غرب کے رب) کی سرزمین میں پھیلنے لگا۔

سورہ فاتحہ کے ساتھ ربط

قرآن حکیم کی پہلی سورت الفاتحہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی تین بنیادی صفات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

(۱) ربوبیت (۲) رحمانیت اور رحیمیت (۳) مالکیت

آخری سورہ الناس میں بھی ان کے مقابلے میں تین صفات کا اعادہ کیا گیا ہے

(۱) ربوبیت (رَبِّ النَّاسِ) (۲) ملوکیت (مَلِكَ النَّاسِ) (۳) الوھیت (اِلٰهِ النَّاسِ)

''سورہ فاتحہ'' میں اللہ تعالیٰ کو ''رب العالمین'' کہا گیا ہے۔ تو ''سورۃالناس'' میں اسے رب الناس بتایا گیا ہے۔ دونوں کا مقصود ایک ہی ہے۔

سورۃ فاتحہ میں ربوبیت کو رحمانیت اور رحیمیت سے مربوط کیا گیا ہے، تو سورۃالناس میں خدا تعالیٰ کی الوہیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ رحمانیت اور رحیمیت دونوں کا عمل ذات خداوندی کو کائنات کا مرکز بناتا ہے جو الوہیت کا کمال ہے۔

سورۂ فاتحہ میں مالک یوم الدین کی طرف توجہ دلائی گئی ہے تو سورۃالناس میں اللہ تعالیٰ کا بطور ملک الناس اشارہ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

سورۂ فاتحہ میں صراط مستقیم کی استدعا کی گئی ہے۔ سورۃالناس میں وسواس کے شر سے بچانے کی دعا کی گئی ہے۔ توحید باری تعالیٰ تک پہنچنے کی عملی شکل صراط مستقیم کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے؟ اس راہ میں وسواس سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ سورۂ فاتحہ میں صراط مستقیم کی استدعا کی گئی ہے۔ تو سورۃالناس میں صراط مستقیم سے ہٹانے کی کوشش کرنے والی طاقت ''الوسواس الخناس'' کے دو مظاہر ''الجنة والناس'' کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس 'وسواس الخناس'

کے اثر سے جب قومیں صراط مستقیم سے ہٹتی ہیں تو یا تو وہ یہود صفت بن کر "مغضوب علیہ" ہوتی ہیں یا نصاریٰ صفت بن کر "ضآلین" میں شمار ہوتی ہیں۔

گویا قرآن حکیم کو ان آخری تین سورتوں میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، ملوکیت (یا مالکیت) اور الوہیت کی طرف توجہ دلا کر صراط مستقیم یا توحید کے بنیادی فکر پر استقامت حاصل کرنے کی ضرورت بتائی گئی ہے کہ یہی ایک چیز شرف انسانی کی بنیاد ہے اور اسی سے نوع انسانی کے لئے ہر قسم کی مادی اور معنوی ترقیوں کی راہیں کھلتی ہیں۔ یہی فکر قرآنی انقلاب کا بنیادی فکر ہے۔ جس پر ساری نوع انسانی کو جمع کرنا انسانیت کی طبعی ضرورت ہے۔